بنیاد جلد چہارم ۲۰۱۳ء

محمد حمزہ فاروقی *

اردو صحافت کا انقلاب آفریں نمائندہ: روزنامہ "انقلاب" اور اس کا سیاسی کردار

عبدالمجید سالک نے ۱۹۱۲ء میں اور مولانا غلام رسول مہر نے فروری ۱۹۲۲ء میں زمیندار کی ادارت سنبھالی۔ یہ تحریکِ خلافت کا زمانہ تھا اور دونوں حضرات نظریاتی اور عملی اعتبار سے 'ترکِ موالات' اور 'تحریکِ خلافت' سے وابستہ تھے۔ زمیـــــنـــــدار اور اس کے مالک و مدیر مولانا ظفر علی خاں ان تحریکات میں پیش پیش تھے۔ ظفر علی خاں تو اس تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں پانچ سال کے لیے قید کر لیے گئے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں سالک بھی ایک سال کے لیے داخلِ زنداں ہوئے۔ مہر اور سالک نے جدوجہدِ آزادی اور تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ پھر ایسے حالات درپیش ہوئے کہ یہ دونوں حضرات مارچ ۱۹۲۷ء میں عملۂ زمیندار کے ساتھ مُستعفی ہو گئے۔

مہر کی دیرینہ خواہش تھی کہ اپنا اخبار نکالیں اور قومی خدمت سے متعلق جذبات و خیالات کا آزادانہ اظہار کریں۔ تربیت یافتہ عملہ ان کے ساتھ تھا۔ گذشتہ برسوں میں ان کا حلقۂ احباب خاصا وسیع ہو چکا تھا اور ان سے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ اخبار کے لیے قرضِ حسنہ دے سکیں۔ انھیں برسرِ اقتدار یونینسٹ پارٹی کی آشیرباد اور مالی تعاون بھی میسر تھا۔ چناں چہ ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو انقلاب عالمِ وجود میں آیا۔

مہر اور سالک کے درمیان دورِ زمینداری میں دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس کی بنیادی وجوہ یہ تھیں۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ فارسی شعر و ادب کا ذوق دونوں میں مشترک تھا۔ دونوں کا سیاسی مسلک بھی یکساں

تھا۔ دونوں میں اشتراکِ فکروعمل اس قدر تھا کہ زمیندار اور انقلاب کے اٹھائیس سالہ دور میں کبھی اختلاف کی نوبت نہ آئی۔ سالک بے پناہ متحمل مزاج تھے۔ مہر کا انقلاب کے ادارتی امور سے تعلق تھا جبکہ سالک انتظامی امور کے نگران تھے۔ مہر اداریہ نویس تھے اور سالک فکاہیہ کالم ''افکاروحوادث'' لکھا کرتے تھے۔

انقلاب کے ابتدائی دور میں پنجاب میں ہندو اور سکھ تجارت، صنعت اور سرکاری ملازمتوں میں چھائے ہوئے تھے۔ مسلمان زیادہ تر زراعت سے وابستہ تھے اور ہندو ساہوکار گراں قدر شرح سود کے ذریعے ان کی زمینیں ہتھیانے کے درپے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ۱۹۱۶ء کے معاہدۂ لکھنؤ کے ذریعے مسلمانوں کو جداگانہ طرزِ انتخاب تو میسر آیا لیکن بنگال اور پنجاب میں انھیں آبادی کے تناسب سے حقِ تناسب نہ مل سکا۔ پنجاب میں مسلمان ۵۶ فی صد تھے اور بنگال میں ۵۵ فی صد لیکن انھیں قانون سازی اور بلدیاتی اداروں میں ۵۰ اور ۴۰ فی صد نیابت ملی۔ اس زمانے میں ووٹنگ جائیداد اور تعلیم سے مشروط تھی۔ مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کی نسبت زیادہ غریب، پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے ان کے اصل نمائندے منتخب نہ ہو پاتے اور ان اداروں میں جاگیردار یا زمیندار منتخب ہوتے جنھیں قومی مفاد سے زیادہ نام و نمود اور ترقی عزیز تھی۔

انقلاب مسلم حقوق کے چمپئن کے طور پر اُبھرا۔ اُس نے آبادی کے تناسب سے نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے مسلسل جہاد جاری رکھا۔ مدیرانِ انقلاب نے جداگانہ طرزِ انتخاب کی حمایت جاری رکھی جو مسلمانانِ ہند کے منفرد سیاسی حقوق کا ضامن تھا اور ہندو قومیت کے سیلاب کے آگے بند کا کام دیتا رہا۔ ۲۸۔۱۹۲۷ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح چند آئینی تحفظات کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر آمادہ تھے تو سر محمد شفیع نے اس سے اختلاف کیا اور طریقِ انتخاب کے سوال پر لیگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مدیرانِ انقلاب نے اس وقت شفیع لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ شفیع لیگ میں اقبال بھی شامل تھے اور اس جماعت نے ہندوستان کی دیگر جماعتوں کے برعکس سائمن کمیشن سے تعاون کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آنے والی آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی حقوق کی حفاظت کی جا سکے اور ان کی تہذیب و ثقافت کو ہندو تہذیب و ثقافت اور زبان کے غلبے سے بچایا جا سکے۔

انقلاب ساڑھے بائیس برس کے عرصے میں عروج و زوال کی منازل سے گزرا۔ ان عوامل کا تجزیہ

اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس اخبار کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ پنجاب کی سیاسی تاریخ کے مدوجزر سے وابستہ رہے۔ انقلاب کا جب آغاز ہوا تو اسے اقبال کی فکری رہنمائی اور اخلاقی تائید میسر تھی، لیکن اسے مالی اور سیاسی استحکام یونینسٹ پارٹی نے فراہم کیا تھا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن معاہدۂ لکھنؤ سے ان کی اکثریت بے اثر ہوگئی۔ پنجاب میں اقتصادی، سیاسی اداروں اور مختلف شعبوں میں ہندو اور سکھ اقلیتوں کی بالا دستی تھی اور وہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ تھی۔ انقلاب نے ابتدا ہی سے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑی اور مقبولیت حاصل کی۔

کانگرس قائدین نے سائمن کمیشن کے مقابلے میں ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں ہندوستان کا آئندہ دستور وضع کرنے کے لیے ایک ذیلی جماعت مرتب کی۔ اس کے صدر موتی لال نہرو تھے اور دیگر ارکان میں سر علی امام، شعیب قریشی، ایم۔ ایس آنیے، ایم۔ آر جیکر، جی۔ آر پردھان، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو، ایم۔ این جوشی اور سبھاش چندر بوس تھے۔[1]

انقلاب نے ۱۲ اگست ۱۹۲۸ء کو ایک خاص نمبر شائع کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمتی تجاویز پر سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی۔ اس نمبر میں میثاقِ لکھنؤ، میثاقِ بنگال، میثاقِ لاجپت اور انصاری اور مختلف ادوار میں پیش کی گئی مسلم رہنماؤں کی تجاویز شامل تھیں۔[2]

۱۵ اگست ۱۹۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی تو وہ مسلمانانِ ہند کی توقعات پر پوری نہ اُتری اور درحقیقت نہرو رپورٹ کے ذریعے ہندو اکثریت کے غلبے کا آئینی خاکہ وضع کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

ا۔ ملک بھر میں بلا امتیاز مخلوط انتخاب رائج کرنے پر زور دیا گیا۔

ب۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور الگ صوبہ بنانے کی تائید کی گئی بشرطیکہ مجوزہ صوبہ اپنا اقتصادی بوجھ اُٹھانے والا ہو۔

ج۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے سے انکار کیا گیا۔

د۔ ملک میں وفاقی طرز کی بجائے وحدانی طرزِ حکومت کی سفارش کی گئی۔

ہ۔ کامل آزادی کی بجائے درجۂ مستعمرات کے حصول کو نصب العین قرار دیا اور عورتوں کو نمائندگی کا حق

دیا گیا۔

کانگرس کے مجوزہ آئینی خاکے میں نام نہاد ہندی قومیت پر اس قدر زور دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے منفرد سیاسی حقوق کی سرے سے گنجائش نہ تھی۔ پنجاب کے خلافتی اور قومیت پرست رہنماؤں نے ۲۸ اگست کو لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کی اور نہرو رپورٹ کو تسلیم کر لیا۔ مسلم قائدین کا معتدل مزاج طبقہ جن میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شفیع داؤدی، شعیب قریشی اور جمعیت مرکزیہ خلافت اور جمعیۃ العلما کے اکابر شامل تھے، نہرو رپورٹ کے مخالف تھے۔

مہر نے اس وقت نہرو رپورٹ کے خلاف اداریے لکھے۔ مدلل اور منطقی انداز سے اس کے مسلم ضرررساں پہلوؤں کا جائزہ لیا اور مسلم رائے عامہ کو بیدار کیا۔ انھوں نے اعداد و شمار کا سہارا لے کر رپورٹ کی مسلم دُشمنی کو آشکار کیا۔

مسلم قیادت کا ایک حصہ، جس میں جناح اور مولانا محمد علی شامل تھے، رپورٹ میں آئینی ترامیم کے ذریعے مسلم مفادات کی تحفیظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر آمادہ تھا، لیکن کانگرس اور ہندو مہا سبھا اس رپورٹ کو حرفِ آخر تصور کرتی تھی اور کسی ترمیم کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

مہر نے اس دور میں تاریخ ساز کردار انجام دیا۔ آپ کے نزدیک مخلوط انتخاب کسی صورت میں بھی قابل قبول نہ تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے اداریوں اور مضامین میں رپورٹ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت نے انقلاب کی ساکھ جمائی اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

نہرو رپورٹ کے متعلق مولانا محمد علی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو پٹنہ کے ایک جلسہ میں فرمایا:

> ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں جب منادی دی جاتی تھی تو منادی پکارتا تھا کہ خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا لیکن نہرو رپورٹ کا ملخص یہ ہے کہ خلقت خدا کی، ملک وائسرائے کا یا پارلیمنٹ کا اور حکم ہندو مہاسبھا کا۔ درجۂ مستعمرات تسلیم کر لینے اور اس میں بھی مسلمانوں کے تحفظِ حقوق سے انکار کر دینے کے بھی وہی معنی ہیں۔ [۳]

نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد انقلاب میں مسلمانوں کا ردِعمل مختلف انداز میں ظاہر ہوا۔ مرتضیٰ احمد خاں مے کش نے دسمبر ۱۹۲۸ء میں انقلاب میں ایک سلسلۂ مضامین ''ہندی مسلمانوں کے لیے الگ

وطن''، کے عنوان سے شائع کیا۔ ان مضامین میں انھوں نے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں پر مبنی مسلم مملکت کے قیام پر زور دیا۔ مے کش نے ۱۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کے انقلاب میں لکھا:

> ان حالات کے اندر یہ اشد ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بھی ایک ایسا وطن پیدا کیا جائے جسے وہ اپنا گھر سمجھیں اور جہاں رہ کر وہ اپنی تہذیب، اپنے افکار اور اپنے تمدن و معاشرت کو اپنی منشا اور خواہشات کے مطابق ترقی دے سکیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس سرزمین میں ایک الگ وطن نہ دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے وطن پیدا کرنے کے واسطے کسی بڑی جستجو کی ضرورت نہیں۔ صرف صوبہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو یک جا تصور کر کے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بنا بنایا وطن مل سکتا ہے۔ [۴]

اقبال نے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو خطبۂ الٰہ آباد پیش کیا تو اس کا اردو ترجمہ مہر نے کیا تھا اور مولوی محمد یعقوب ایم ایل اے سکریٹری مسلم لیگ نے حاضرین کو اردو ترجمہ سنایا۔[۵] یہ ترجمہ ۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو انقلاب میں شائع ہوا۔[۶]

اقبال نے فرمایا تھا:

> میں پنجاب، شمال مغربی صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ضم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود اختیاری حکومت یا تو سلطنتِ برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنتِ برطانیہ کی حدود سے باہر ہو، شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتی ہے۔ [۷]

اقبال کی مجوزہ ریاست میں بنگال شامل نہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

> قسمتِ انبالہ اور چند ایسے اضلاع جہاں غیر مسلم اکثریت، نکال دینے سے یہ کم وسعت اور زیادہ مسلم آبادی کا علاقہ بن جائے گا۔ مجوزہ انتظام سے غیر مسلم اقلیتوں کی حفاظت کا بہتر انتظام ممکن ہوگا۔ اس تصور سے ہندوؤں یا انگریزوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ [۸]

سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے الگ ہونے کے بارے میں اقبال نے اسی خطبے میں فرمایا:

> سندھ کی پشت ہند کی جانب اور چہرہ وسط ایشیا کی طرف ہے۔ مزید یہ کہ اس کے زرعی مسائل، جن سے حکومتِ بمبئی کو کوئی ہمدردی نہیں اور لامحدود تجارتی امکانات کے پیش نظر کراچی ترقی پا کر ہند کا دوسرا دارالحکومت بن جائے گا۔ میں اسے غیر مناسب سمجھتا ہوں کہ

اسے (سندھ) ایک ایسی پریزیڈنسی سے وابستہ رکھا جائے جس کا رویہ آج تو دوستانہ ہے لیکن تھوڑے عرصے ہی بعد اس کا رویہ مخاصمانہ ہونے کا امکان ہے۔[9]

اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد سے مسلمانوں پر تو کوئی خاص اثر نہ ہوا لیکن ہندو سیاست دانوں اور اخبارات نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کی الگ ریاست کا تصور ہندوؤں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ یہ نام نہاد ہندی قومیت کے منافی تھا اور بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھا۔ ہندو اخبارات اور معترضین کے جواب کے لیے انقلاب کے صفحات تھے۔ مہر نے ۲۲ جنوری ۱۹۳۱ء کے ایک اداریے میں لکھا:

> اگر مسلمانوں کے مطالبات جو اقل قلیل ہیں، منظور کر لیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب، صوبۂ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں وہ اپنی اکثریت کی وجہ سے غالب رہیں گے اور ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت ان کے اس غلبہ و اقتدار میں دست اندازی نہ کر سکے گی۔ علامہ اقبال بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ انھوں نے صرف اتنا اضافہ فرمایا ہے کہ یہ اسلامی صوبے متحد ہو کر ایک اسلامی سلطنت کے قیام کا نصب العین کسی بھی طرح غیر حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔[10]

انقلاب کے ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کے اداریے میں مہر نے لکھا:

> ہندو چاہتے تھے کہ مسلمان ''قومیت و جمہوریت'' کے ان فریب کارانہ دعاوی کے ''حشیش'' سے مدہوش رہیں جو ہر ہندو کی زبان کا مایۂ گفتار ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنی قومی تقدیر سے آشنا نہ ہوں۔ ہندوؤں کے گانٹھے ہوئے منصوبوں کے نتائج و عواقب سے آشنا نہ ہوں۔ سمجھتے ہیں کہ ہندو قوم جو کچھ کر رہی ہے ''قومیت و جمہوریت'' کے لیے کر رہی ہے اور اسی طرح چپ چاپ ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے گا لیکن حضرت علامہ اقبال کی حق پرست آواز نے ہندو سلطنت، ہندو راج اور ہندو حکومت کے حصار کا طلسم باطل توڑ ڈالا ہے۔[11]

مہر نے ایک اداریے میں شمال مغربی صوبوں کی مردم شماری کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم آبادی کا تعین کیا اور یہ ثابت کیا کہ ضلع انبالہ کی عدم شمولیت کے نتیجے میں مسلم آبادی اس خطے میں ۶۲ فی صد سے بڑھ کر ۶۷

فی صد ہوتی اور ہندو آبادی کی شرح ۲۸ فی صد سے کم ہو کر ۲۲ فی صد رہ جاتی جبکہ سکھ آبادی ۱۰ فی صد رہتی۔ اگر دریائے ستلج کو پنجاب کی آخری حد قرار دیا جاتا جیسا کہ سکھ عہد میں تھا تو مسلم آبادی کا تناسب بڑھ جاتا اور پنجاب کو قدرتی سرحد میسر آتی۔[12]

آل انڈیا مسلم کانفرنس ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو وجود میں آئی۔ اس کی تاسیس میں میاں فضل حسین کا ہاتھ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے غیر مؤثر ہونے کی بنا پر مسلم کانفرنس نے سیاسی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ان معنوں میں سیاسی جماعت نہ تھی جیسی کانگرس یا مسلم لیگ تھیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ ان ہم خیال مسلم اشرافیہ کا گروہ تھا جو مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ میاں فضل حسین سیاست میں عوام کی شمولیت کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک سیاست شطرنج کے کھیل کی مانند تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی بھی عوامی جماعت نہ تھی اور پنجاب اسمبلی کے باہر اس کا وجود نہ تھا۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں اقبال مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔[13]

آل انڈیا مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں ہونے والا تھا۔ مہر نے انقلاب کے اداریوں میں اقبال کی حمایت کی اور ان کی سرکردگی میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے حل پر زور دیا۔ مہر نے ۱۶ جنوری ۱۹۳۲ء کے اداریے میں لکھا:

> خوش قسمتی سے ہمیں کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے حضرت علامہ اقبال کی سی شخصیت میسر آ گئی ہے اور ہمیں کامل اُمید ہے کہ حضرت ممدوح اس نازک وقت میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے اور آپ کا پیغامِ عمل مسلمان نوجوانوں کی رگوں میں خونِ تازہ کی لہر دوڑا دے گا۔ مسلمانانِ ہند کو چاہیے کہ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں۔[14]

مہر نے ۱۰ مارچ ۱۹۳۲ء کو مجوزہ کانفرنس کے بارے میں اداریے میں لکھا:

> قارئین کرام کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کی صدارت حضرت علامہ اقبال نے منظور فرمائی ہے۔ الٰہ آباد مسلم لیگ کے بعد یہ دوسرا موقع ہے کہ مسلمانانِ ہند کو حضرت علامہ کے پاکیزہ خیالات سننے کا فخر حاصل ہوگا۔ آپ کانفرنس کا خطبہ تحریر فرما رہے ہیں جس میں آپ مسلمانوں کے لیے ایک صاف اور واضح راہِ عمل کی تلقین فرمائیں گے۔ اس کے علاوہ

ہندوستان بھر کے مسلمان اکابرین اس موقع پر جمع ہو کر اپنے اپنے خیالات مسلمانوں کے سامنے پیش کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ آج کل انتہائی ہیجان و اضطراب میں مبتلا ہے۔ نہ کانگرس نے اس کے حقوق تسلیم کیے ہیں نہ حکومت نے ان کے حق میں کوئی اعلان کیا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہر خیال اور ہر عقیدے کے مسلمان متحد ہو کر بیٹھیں اور اپنی ایک تنظیم کا لوہا حکومت اور ہنود دونوں سے منوا سکیں۔[15]

۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہوا۔ مہر نے اقبال کے خطبۂ صدارت کے متعلق ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کے اداریے میں لکھا:

حضرت علامہ اقبال نے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ حضرتِ ممدوح کے خطبۂ لیگ کی طرح خطباتِ صدارت کی تاریخ میں بالکل یگانہ حیثیت رکھتا ہے اور حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی سے ہر مسلمان کو ایسے ہی خطبے کی توقع تھی۔ خطبے کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث کا یہ موقع نہیں۔ اس کا ہر حصہ ضروری ہے۔ سیاسی صورتِ حالات، سرحد، کشمیر اور تنظیمِ ملی کا پروگرام، خطبے کے یہ چار اجزا ہیں۔ اول الذکر تین اجزا کے متعلق تمام ضروری امور انتہائی صفائی کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔ ذمہ دارانِ انتظام کی غلطیاں، مسلمانوں کے ترجمانوں کی لغزشیں اور عام مسلمانوں کے جذبات و احساسات۔

مہر نے خطبۂ اقبال کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

ہمارے نزدیک حضرت علامہ کے خطبے کا ایک اہم حصہ وہ ہے جس میں حضرت موصوف نے موجودہ سیاسی صورتِ حال کی بحث کے نتائج پیش کیے ہیں مثلاً یہ کہ:

۱۔ مسلمان برطانیہ کے اوضاع و اطوار سے بدظن ہو رہے ہیں۔

۲۔ اکثر اشخاص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ کیا مسلم اقلیت کے لیے تیسری پارٹی کا وجود عناد کیش اکثریت کے خلاف کوئی حقیقی تحفظ ہے؟

۳۔ انگلستان کا نظامِ حکومت پارٹیوں کی اکثریت و اقلیت پر مبنی ہے، جو لوگ حکومت کے مصیبت خیز اوقات میں تعاون کرتے ہیں انھیں ہر لحظہ شبہ رہتا ہے کہ اگر اس مدت کے گزر جانے کے بعد انگلستان میں دوسری پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی تو وہ اس تعاون کو قابلِ قدر سمجھے

گی یا نہیں۔

۴۔ مسلمانوں کو کسی ایک پارٹی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک ایسی پالیسی وضع کرنی چاہیے جو بالغ نظرانہ اسلامی مفاد پر مبنی ہو اور جس سے برطانیہ کے تمام باشندوں پر اثر پڑے۔

۵۔ حکومتِ برطانیہ کا دعویٰ ہمیشہ یہ رہا کہ وہ ہندوستان میں توازن قائم رکھنے کے لیے موجود ہے لیکن موجودہ رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غیر جانبدار ثالث کی حیثیت سے رہنے کی نیت نہیں رکھتی۔

۶۔ اکثریت ہمارے پیش کردہ تحفظات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ حکومت کی روش سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قدیم برطانوی جرأت و دیانت کی جگہ متزلزل و غیر مستقل حکمتِ عملی پر آ گئی ہے جس پر کوئی اعتماد نہیں کر سکتا۔

۷۔ مسلمان یہ غور کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی موجودہ پالیسی سے انگریزوں کی مشکلات تو دور ہو گئیں لیکن مسلمانوں کے لیے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔

آخر میں حضرت ممدوح نے فرمایا:

اگر تم موجودہ حکمتِ عملی کو ترک کر دینے کا فیصلہ کرو تو تمھارا قومی فرض ہو گا کہ ساری قوم کو ایثار کے لیے تیار کر دو، جس کے بغیر کوئی خوددار قوم عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں نازک وقت آ پہنچا ہے، اپنا فرض ادا کرو یا مٹ جاؤ۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا کانفرنس ادائے فرض کے لیے اُٹھے گی؟[16]

انقلاب نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو اخبار کا خصوصی شمارہ چھپا جس میں اقبال کا خطبۂ صدارت اور آل انڈیا مسلم یوتھ کانفرنس کے صدر حاجی عبداللہ ہارون کا خطبہ شامل تھا۔[17]

اس زمانے میں اقبال مہر و سالک کے سیاسی و فکری مرشد تھے لیکن ان کے مالی مفادات یونینسٹ پارٹی سے منسلک تھے اور اس پارٹی کی قیادت کے مسلم لیگ سے اختلافات کھل کر سامنے نہ آئے تھے اس لیے مہر اور سالک مسلمانوں کے عمومی مسائل کے حل کے لیے مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے۔ تاہم دو باتوں میں وہ میاں فضل حسین کے ہم نوا تھے اور اس پر کسی انحراف پر آمادہ نہ تھے۔ ایک جدا گانہ انتخاب اور دوسرا بنگال اور

پنجاب میں آبادی کے تناسب سے مجالسِ قانون ساز میں نمائندگی کا مسئلہ تھا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے بعد میاں فضل حسین کی در پردہ کوشش کے نتیجے میں برطانوی وزیرِ اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت تسلیم کر لی تھی لیکن یہ اکثریت ان کی آبادی کے تناسب سے نہ تھی۔ پنجاب میں سکھوں کو ان کی آبادی سے زیادہ حقِ نمائندگی میسر تھا اور یہ مسلمانوں کے لیے پریشان کن صورتِ حال تھی۔ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کی معمولی اکثریت نے یونینسٹ پارٹی کے قدم جما دیے اور انھوں نے نہ تو شہروں سے اُبھرنے والے متوسط طبقے کے سماجی اور سیاسی شعور کو پھلنے پھولنے دیا اور نہ ہی سیاسی بیداری کو اُبھرنے دیا۔

یونینسٹ پارٹی اقتدار پرست، رجعت پسند زمینداروں اور جاگیرداروں کا سیاسی گروہ تھا جو اقتدار میں رہنے کے لیے انگریزوں کی سرپرستی کا محتاج تھا۔ انھیں ہم خیال ہندو اور سکھ قائدین کا تعاون میسر تھا جن کی مدد سے انھوں نے پنجاب اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی تھی۔

قائدِ اعظم اپریل ۱۹۳۶ء میں جب لاہور تشریف لائے تو ان کے پیشِ نظر ۱۹۳۷ء کے انتخابات تھے جو ۱۹۳۵ء کی دستوری اصلاحات کے بعد منعقد ہونے والے تھے۔ لاہور میں جناح نے میاں فضل حسین سے ملاقات کی اور مجوزہ انتخابات میں تعاون کے طلب گار ہوئے۔ میاں صاحب نے مسلم لیگ کی پنجاب میں انتخابی عمل میں شمولیت کی شدید مخالفت کی اور انتخابی تعاون سے انکار کیا۔ جناح، یکم مئی ۱۹۳۶ء کو اقبال سے ملے تو آپ نے نہ صرف جناح کی قیادت کو قبول کر لیا بلکہ مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور نیلی پوش تنظیم کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔

یونینسٹ پارٹی کی قیادت جب تک مسلم لیگ کی مخالفت میں کھل کر سامنے نہ آئی مدیرِ انقلاب منقار زیرِ پر رہے لیکن مخالفت کا آغاز ہوتے ہی مدیرانِ انقلاب یونینسٹ پارٹی کا حقِ نمک ادا کرنے کے لیے میدان میں کُود پڑے۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو اقبال نے ایک بیان میں یونینسٹ پارٹی کی رجعت پسندی اور منافقت کو طشت از بام کیا تو انقلاب نے اس بیان کو شائع تک نہ کیا۔[۱۸] مدیرانِ انقلاب اقبال کو اپنا سیاسی اور فکری مرشد تسلیم کرتے تھے لیکن انھوں نے اس بیان کو انقلاب کے صفحات میں جگہ تک نہ دی۔ مہر نے ۱۵ مئی، ۱۷ مئی اور ۲۴ مئی ۱۹۳۶ء کے اداریوں میں اس کا جواب لکھا۔

ان کے نزدیک مسلم لیگ کی آنے والے انتخابات میں شمولیت اور یونینسٹ پارٹی کی مخالفت ''مسٹر

جناح کی سعی کو عناصرِ افتراق کی تقویت کے سوا اور کیا قرار دے سکتے ہیں''۔ مسلم لیگ کی تنظیمِ نو اور مسلمانانِ ہند کو متحد و منظّم کرنے کے متعلق مہر کا تبصرہ یہ تھا کہ ''داخلی کش مکش برپا کریں اور ایک دوسرے سے لڑائی چھیڑ کر اپنی قوتوں اور مسلمانوں کے مستقبل کو نقصان پہنچائیں''۔[۱۹]

مسلم لیگ کی تنظیمِ نَو مسلمانانِ ہند کی سیاست میں نئے دور کا آغاز تھا۔ یونینسٹ پارٹی زمانے کے بدلتے مناظر میں اپنی افادیت کھو رہی تھی۔ عوام کے سیاسی شعور کی بیداری اور کاروبارِ سیاست میں ان کی شمولیت وقت کی اہم ضرورت تھی۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار سیاسی تحریکات اور آئینی اصلاحات کے نفاذ کے بعد کمزور ہو رہا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک ملک گیر سیاسی تنظیم کی ضرورت تھی جو کانگرس اور دیگر ہندو فرقہ پرست تنظیموں کا مقابلہ کرتی اور اکھنڈ بھارت کے خواب کو پریشان کرتی۔ اگر وہ علاقائی تنظیموں کے زیرِ سایہ منتشر و درماندہ رہتے تو برطانوی سامراج اور ''ہندو کانگرس'' کے طاغوتی عزائم کا مقابلہ نہ کر پاتے۔

میاں فضل حسین ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو انتقال کر گئے۔ انتقال سے قبل میاں صاحب آئندہ انتخابات کے لیے یونینسٹ پارٹی کی قیادت تیار کر چکے تھے۔ ان کے جانشین سردار سکندر حیات مختلف ڈھب کے آدمی تھے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات یونینسٹ پارٹی کا نقطۂ عروج تھے۔ پنجاب اسمبلی میں یہ اکثریتی جماعت بن کر اُبھری۔ مدیرانِ انقلاب نے بھی خوب حقِ نمک ادا کیا۔ پنجاب میں مسلم لیگ بے سروسامانی کے عالم میں تھی اور مدیرانِ انقلاب کی پھبتیوں اور تنقید کی سزاوار ٹھہری۔

جنوری ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگرس نے چھ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی۔ مسلم لیگ مسلم اقلیتی صوبوں میں خاصی کامیاب رہی لیکن مسلم اکثریتی صوبوں میں ناکام رہی۔ انتخابات جیتنے کے بعد کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے جارحانہ رویہ اپنایا اور اس کا اظہار مختلف سطحوں پر ہوا۔ نہرو مسلمانوں کے منفرد سیاسی حقوق اور جداگانہ تشخص کے مخالف تھے۔ وہ ہندی قومیت، مغربی جمہوریت اور سوشلزم پر یقین رکھتے تھے۔ مغربی طرزِ جمہوریت کے وہ اس لیے خواہاں تھے کہ اس کے بلا امتیاز نفاذ سے ہندو غلبے کی راہ ہموار ہوتی تھی۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مذہبی، لسانی اور نسلی اختلافات بہت نمایاں تھے، وہاں نہ تو ہندی قومیت کا تصور کامیاب ہو سکتا تھا اور نہ ہی مغربی جمہوریت کا بلاترمیم نفاذ کامیابی کا ضامن بن سکتا تھا۔

صوبۂ سرحد میں کانگرس اقلیتی پارٹی تھی لیکن وہاں کانگرس خان برادران کے تعاون سے جوڑ توڑ کے

ذریعے اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ کانگرس کی نظریں سندھ پر تھیں اور سندھ میں ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کانگرس نے مسلم لیگ کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلم رابطۂ عوام مہم شروع کی۔ کانگرس کی جارحیت اور مسلمانوں کے خلاف یلغار نے مسلم اکثریتی صوبوں کی قیادت کو مسلم لیگ کی چھتری تلے پناہ لینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بنگال آسام اور پنجاب کے وزرائے اعظم نے نہ صرف شرکت کی بلکہ مسلم لیگ میں شمولیت کا بھی اعلان کیا۔ مولوی ابوالقاسم فضل حق، سر سعد اللہ خان اور سر سکندر حیات نے جناح اور لیگ کو بے پناہ تقویت بخشی۔ پرانے خلافتی رہنما مولانا شوکت علی اور ظفر علی خان بھی لیگ میں شامل ہوگئے۔[20]

سکندر حیات خان جناح کی عوامی مقبولیت اور مسلمانانِ ہند پر ان کے اثر و رسوخ سے بخوبی واقف تھے اور جناح سے بنائے رکھنے میں ہی عافیت جانتے تھے۔ انھوں نے کانگرسی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے ''سکندر جناح پیکٹ'' کا سہارا لیا تھا لیکن وہ مسلم لیگ سے مخلص نہ تھے اور نہ ہی پنجاب میں مسلم لیگ کو فعال دیکھنا چاہتے تھے۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے واحد نمائندے سے ان کی مخاصمت تھی۔ وہ ہر حال میں یونینسٹوں کی بالادستی اور اقتدار کے خواہاں تھے۔

جناح اس صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن کانگرس کا مقابلہ اور برطانیہ سے آزادی کی جنگ میں اپنی قوت مقامی مسلم قیادت سے ٹکرا کر برباد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ووٹروں کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے۔ انھیں آئندہ سیاسی جنگ میں بہر حال ان دو صوبوں کے عوام کو ساتھ ملانا تھا۔ پنجاب میں یونینسٹوں سے براہِ راست ٹکراؤ کے بغیر وہ رفتہ رفتہ مسلم لیگ کی سیاسی قوت میں اضافہ اور اثر و نفوذ بڑھاتے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے مقررہ وقت پر انتخابات تو نہ ہوئے لیکن لیگ ضمنی انتخابات میں موثر قوت بن کر اُبھرتی رہی۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء سر سکندر حیات اور جناح کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی ایک شق یہ تھی:

> سر سکندر حیات خان واپس پنجاب جا کر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے جس میں پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے، ہدایت کریں گے کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اندریں

> حالات وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے، لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہوگا۔[21]

اس معاہدہ پر کسی دور میں بھی عمل نہیں ہوا۔ جب تک سر سکندر حیات زندہ رہے، انھوں نے معمولی اختلافات کے باوجود لیگی قیادت سے بنائے رکھی۔ لیکن معاہدے کی مندرجہ بالا شق ایسا ٹائم بم تھی جس نے کسی مرحلے پر پھٹنا تھا اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی راہیں جدا کرنا تھا۔

پنجاب کی سیاسی تاریخ میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ایسا تھا جس کے اثرات برسوں پنجاب کی سیاست پر رہے۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا سکھوں کے ہاتھوں شہید ہونا اور یونینسٹوں کی سکھوں کو اس اقدام سے روکنے میں ناکامی، یونینسٹ پارٹی کی مسلمانوں میں غیر مقبولیت کا سبب بنی۔ مجلس احرارِ اسلام بھی مسجد شہید گنج کے ملبے تلے دب گئی اور ایک مقبول سیاسی جماعت کی حیثیت سے دوبارہ نہ اُبھر سکی۔

دوسرا اہم واقعہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے منعقدہ لاہور میں قرار دادِ پاکستان کا منظور ہونا تھا۔ اس کے بعد مسلم لیگ پنجاب میں مقبول اور موثر ہوتی گئی اور یونینسٹ پارٹی نمک کے تودے کی مانند سیاست کے دریا میں پگھلتی چلی گئی۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں سر سکندر حیات خان کی اچانک موت یونینسٹ پارٹی کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ ان کے جانشین سر خضر حیات ٹوانہ نہ تو عوام میں اس قدر مقبول تھے اور نہ انھیں اپنے پیشرو جیسا تدبر، سیاسی بصیرت اور دور اندیشی میسر تھی۔ انھوں نے ظاہری احتیاط کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر آویزش کی راہ اپنائی۔ انھیں اندازہ نہ تھا کہ مسلم لیگ پنجاب میں ۳۷-۱۹۳۶ء کے دورِ کسمپرسی سے نکل کر ایک مضبوط اور توانا جماعت بن چکی تھی۔

۱۹۴۴ء کے آغاز میں جناح نے مناسب سمجھا کہ یونینسٹ پارٹی کی منافقت کا پردہ چاک کیا جائے اور سکندر جناح معاہدے کے تحت مسلمان یونینسٹ اراکینِ پنجاب اسمبلی کو مسلم لیگ میں شامل کیا جائے۔ جناح نے فرمایا کہ کوئی شخص بیک وقت دو جماعتوں کا وفادار نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ یونینسٹ پارٹی کا نام ترک کے ''مسلم لیگ کولیشن پارٹی'' کا نام اختیار کیا جائے۔

خضر حیات نے سکندر جناح معاہدے کا سہارا لیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ وہ بیک وقت یونینسٹ اور مسلم لیگی تھے۔ انھوں فرمایا کہ معاہدے کی رُو سے پنجاب وزارت یونینسٹ کا لاحقہ برقرار رکھے گی اور جناح

صوبائی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ خضر حیات نے جس معاہدے کا سہارا لیا تھا، اس پر سکندر حیات کے دور سے اس وقت تک عمل ہی نہیں ہوا تھا۔ جناح کو بجا طور پر خضر حیات خان کی بیان کردہ تعبیر سے اختلاف تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ معاہدہ برابر کی سطح کے لوگوں کے لوگوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ''کسی لیڈر اور اس کے تابع فرمان کے درمیان کیسے معاہدہ ممکن تھا''۔[۲۲]

۱۹۴۴ء میں پنجاب مسلم لیگ اس قدر توانا ہو چکی تھی کہ یونینسٹ پارٹی کی بالا دستی اور اقتدار کو چیلنج کر سکے۔ وہ ایک خوابیدہ جماعت سے اُبھر کر عوامی تحریک کا رُوپ دھار چکی تھی۔ حصولِ پاکستان کے لیے یونینسٹ پارٹی کی رفاقت کا بوجھ اُتارنے پر آمادہ تھی جو اس کے مقاصد کی راہ میں بڑی رُکاوٹ تھی۔ اس کے علاوہ مجوزہ مسلم ریاست میں پنجاب ایک اہم اکائی تھا۔ پنجابی مسلمانوں کی تائید وحمایت کے بغیر پاکستان کا قیام ممکن نہ تھا۔

جناح کو بخوبی اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کی قیادت سے ٹکراؤ مسلم لیگ کے لیے سودمند ہوگا۔ یونینسٹ پارٹی اپنے تضادات، رجعت پسندی اور برطانوی حکمرانوں پر انحصار کرنے کی بنا پر زوال پذیر ہوگی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۴۴ء کو جناح اور خضر حیات لاہور میں ملے، لیکن جناح خضر کو قائل نہ کر سکے۔ مئی ۱۹۴۴ء خضر حیات ٹوانہ مسلم لیگ سے نکال دیے گئے۔ اور عملاً سکندر جناح معاہدہ ختم ہو گیا۔[۲۳]

اس واقعہ کے بعد یونینسٹ پارٹی تیزی سے زوال پذیر ہوئی۔ اس کے ارکان مسلم لیگ میں شامل ہوتے گئے۔ یونینسٹ پارٹی کو سر چھوٹو رام نے سہارا دیا تھا۔ یہ ہندو جاٹوں کے نمائندہ تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے یونینسٹ پارٹی کی پُر جوش وکالت کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں ان کی وفات سے پارٹی کو شدید نقصان پہنچا۔[۲۴]

انقلاب نے خضر اور لیگ تنازعہ کے دوران خضر حیات کا ساتھ دیا اور اس طرح وہ خضر حیات اور یونینسٹوں کی عوام میں غیر مقبولیت کا بھی حصہ دار بنا۔ مہر نے یونینسٹوں کے دفاع میں لکھا:

> تمام یونینسٹ مسلمان پاکستان کو مسلمہ قومی نصب العین سمجھتے ہیں۔ وہ صوبے میں ایک پائیدار اور موثر وزارت بنانا چاہتے ہیں اور ایسی وزارت ان غیر مسلم عناصر کے اشتراک ہی سے بن سکتی ہے جن کے مفاد مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔
>
> ملک خضر حیات خان اور ان کے ساتھی خود اس نظام سے باہر نہیں ہوئے بلکہ انھیں زبردستی نکالا گیا اور علت یہ نہیں تھی وہ پاکستان کے قومی نصب العین سے یا قومی تنظیم کی کسی اصل سے منحرف ہو گئے تھے۔ علت محض یہ تھی کہ وزارتی پارٹی کا نام ''مسلم لیگ کولیشن پارٹی'' ہو۔ یہ بھی نہیں کہ ملک خضر حیات خان کو اس نام سے اختلاف تھا۔ عذر محض یہ تھا کہ جو غیر مسلم عناصر اس کولیشن میں شریک نہیں وہ اس نام کو نہیں مانتے۔[۲۵]

پنجاب کی صورتِ حال مہر کے بیان کے مطابق اس قدر سادہ نہ تھی۔ دونوں جماعتوں کے مقاصد میں جو اختلافات تھے وہ کسی نہ کسی مرحلے پر راستوں کی جدائی پر منتج ہوتے تھے۔ مدیرانِ انقلاب کی یونینسٹ جماعت کی حمایت اس پارٹی کے لیے تو کیا سودمند ہوتی خود انقلاب کے لیے نہایت ضرر رساں ثابت ہوئی۔ اخبار کی اشاعت کم ہوتی گئی۔ مہر و سالک کی سیاسی بصیرت ایسی کشتی کو بچانے میں صرف ہوئی جس کا کھیون ہارا سے بیچ منجدھار ڈبونے کے درپے تھا۔

مہر پاکستان بننے کے مخالف نہ تھے۔ آپ نے مرغوب صدیقی کے خط کا ۱۹۶۶ء کے غیر مطبوعہ خط میں جواب دیتے ہوئے لکھا:

> پاکستان کا مسئلہ معین صورت میں مارچ ۱۹۴۰ء سے پیشِ نظر ہے۔ اس سے بیس سال پیشتر بیسیوں قومی، ملکی اور ملی مسائل سامنے آئے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے مر جانے کے بعد بھی پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے میرے کام کی شہادتیں ملیں گی۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ خود پاکستان کے لیے کسی نے سب سے بڑھ کر کام کیا تو وہ میں ہوں، اس لیے کہ میرے اخبار میں یہ صدا پہلے پہل ۱۹۲۸ء میں بلند ہوئی تھی۔ پھر جب حضرت علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت شائع ہوا تھا اور اس کے خلاف طوفان برپا ہوا تھا، غیروں کا بھی اپنوں کا بھی، تو آپ نے اس طوفان کا مقابلہ نہیں کیا تھا، کیونکہ آپ کا تو وجود بھی اس وقت نہ تھا۔
>
> پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک یہ سفینہ جن طوفانوں اور گردابوں سے گزرا، اگر آپ سے پوچھا جائے تو ان کے بارے آپ کیا بتائیں گے۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس کے خطبۂ استقبالیہ میں حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون نے یہ صدا بلند کی تھی[۲۶] پھر آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی کی فارن کمیٹی جس کے صدر سیٹھ صاحب مرحوم تھے، پاکستان کا پہلا معین جغرافیائی منصوبہ اس کمیٹی نے تیار کیا تھا، جس کے بعد اس معاملے نے محسوس و مشہود عملی شکل اختیار کی۔

میں نے یہ داستان کبھی نہیں سنائی۔ جب کوئی بالغ نظر شخص پاکستان کی تاریخ لکھے گا اور وہ کم از کم ۱۹۳۰ء سے منظوریِ قرارداد کی سرگذشت سامنے لائے گا تو اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

مہر نے نومبر ۱۹۳۸ء سے فروری ۱۹۴۰ء تک سر عبداللہ ہارون اور علی محمد راشدی کے ساتھ پاکستان اسکیم کی تدوین و ترتیب میں حصہ لیا تھا۔ مہر کی مرتب کردہ رپورٹ کی بنیاد پر مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان مرتب کی تھی۔[۲۷]

انقلاب نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران پاکستان کی حمایت میں متعدد مضامین شائع کیے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو مہر نے عبداللہ ہارون کے مالی تعاون سے ایک رسالہ بعنوان سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند شائع کیا۔ اس کا مقصد بیرونِ ہند مسلم لیگ کا پیغام پھیلانا تھا۔ اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور اسلامی ممالک میں تقسیم کیا گیا۔[۲۸]

مہر نے سیاسیات اسلامیان ہند کے متعلق مئی ۱۹۶۵ء خط بنام محمد عالم مختارِ حق میں لکھا:

> سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند بالکل غیر ممکن ہے کہ مل جائے۔ یہ میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھی تھی۔ مسلم لیگ کے شعبۂ خارجہ نے چھاپی۔ اب وہ نہ لیگ رہی، نہ اس کا شعبۂ خارجہ۔ کہاں سے ملے گی۔[۲۹]

مہر نے اسے ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء کو دفترِ امورِ خارجہ آل انڈیا مسلم لیگ (کراچی) کے تعاون سے چھپوایا تھا۔ مہر نے ابتدا میں اختصار کے ساتھ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کی تھی۔ فصل دوم اور سوم میں آپ نے ان عوامل سے بحث کی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی راہیں جدا کرنے کا موجب بنے۔ ان ابواب میں آپ نے ہندوؤں کی تنگ نظری اور مہاتما گاندھی کی منافقانہ پالیسی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

فصل چہارم میں تحریکِ خلافت کے دوران مسلمانوں کی قربانیوں اور سرفروشانہ جدوجہد کا ذکر کیا تھا۔ مہر کو ہمیشہ یہ رنج رہا کہ جب تحریک کامیابی کے نزدیک پہنچی تو پنڈت مدن موہن مالویہ اور گاندھی جی نے اس کا خاتمہ کر کے اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

فصل پنجم میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کے کانگرسی راج میں مسلم تہذیب و ثقافت کو جو نقصانات ہوئے اور ہندو تہذیب و روایات کے احیاء کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کا جائزہ لیا۔ مہر نے بدلائل یہ ثابت

کیا کہ کانگرس کا اقتدار عملاً ہندو راج تھا جس میں مسلمان دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری تھے۔ اس میں مسلمانوں کے وقار، سیاسی اور تہذیبی وجود کی گنجائش نہ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک نے مسلمانوں کی اکثریت کو قومیت کے تصور سے برگشتہ کیا تھا۔

مہر نے تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں اپنی خدمات گنوانے کے لیے ۱۵ جون ۱۹۶۷ء کے ایک غیر مطبوعہ خط بنام بشیر احمد ڈار میں لکھا:

> ان تمام مدعیانِ چراغ افروزیِ پاکستان کو یہ بھی خبر نہیں کہ میری زندگی کب سے اس جہاد کے لیے وقف ہوئی اور معاملہ کہاں تک پہنچ کر اتمام کو پہنچا۔ کیا یہ حقیقت کسی کو معلوم ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جب مسلم لیگ کی خارجہ کمیٹی بنی تھی اور دنیائے اسلام میں مسلمانانِ ہند کی حقیقی پوزیشن واضح کرنے کی ضرورت پیش آئی تو سب سے پہلا رسالہ مجھ سے ہی لکھوایا گیا تھا۔ وہ چھپا ہوا موجود ہے۔ کیا یہ معلوم ہے کہ پاکستان کی پہلی اسکیم میری ہی کوشش سے تیار ہوئی تھی جس کا مسودہ اب بھی سید علی محمد راشدی کے پاس موجود ہے۔ اسی کو دیکھ کر قائداعظم اس طرف مائل ہوئے تھے۔ باقی رہا یہ امر کہ اس جہاد کو اتمام پر پہنچا کر میں نے تقسیمِ پنجاب و بنگال کی مخالفت ضرور کی۔ وہ پاکستان کی مخالفت نہ تھی۔ اور کوئی تھا ہی نہیں جو یہ کام انجام دے سکتا۔ نوائے وقت ۱۹۴۴ء میں نکلا، ڈان ۱۹۴۶ء میں، پاکستان ٹائمز ۱۹۴۷ء میں، امروز ۱۹۴۸ء میں۔

مہر کی مسلم لیگ سے قربت سر عبداللہ ہارون کے دم سے تھی۔ عبداللہ ہارون اور سر سکندر حیات خان، مہر کے قدر دان تھے اور ان کی سیاسی بصیرت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وقتاً فوقتاً ان کی بصیرت اور ذہانت سے مستفید ہوتے تھے۔ ان حضرات کے انتقال کے بعد پنجاب کی مسلم لیگی قیادت سے مہر کے اختلافات بڑھتے رہے اور آپ سر خضر حیات ٹوانہ اور یونینسٹ پارٹی کے قریب تر ہوتے گئے۔ مہر نے جب مقامی مسلم لیگی قیادت جسے آپ ''ہمہ گیر نالائق'' قیادت قرار دیتے تھے، پر تنقید کی تو انھوں نے انقلاب کو پاکستان کا دشمن اور یونینسٹوں کا حاشیہ بردار قرار دیا۔

حکومتِ وقت کی مدح سرائی سے اخبار مالی فوائد تو سمیٹ لیتا ہے لیکن عوام میں مقبولیت کھو بیٹھتا ہے۔ پھر یونینسٹ پارٹی تو آزدی سے چند سال قبل ڈوبتا ہوا سورج تھی جس کی پوجا مہر و سالک کر رہے

تھے۔ چناں چہ انقلاب اور مہر نے حصولِ پاکستان کے لیے جو قابل قدر خدمات انجام دی تھیں وہ مخالفانہ پروپیگنڈے میں گہنا گئیں اور یونینسٹوں کی حمایت نے انھیں عوام میں معتوب کر دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد برِصغیر پاک و ہند میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں دو باتیں ناگزیر تھیں۔ ایک یہ کہ برطانوی سامراج کے دن گنے جا چکے تھے اور حکومتِ برطانیہ ہندوستان پر حکمرانی کے لائق نہ رہی تھی۔ جنگ میں انگلستان فاتح بن کر اُبھرا تھا لیکن عالمی جنگ نے اس کا تمام کس بل نکال دیا تھا۔ معاشی اور سیاسی عوامل کی بنا پر ہندوستان پر حکمرانی اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ دوسرا امر یہ تھا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ تصورِ پاکستان مسلمانانِ ہند کی دلوں کی دھڑکن میں جاگزیں تھا اور ان کی امنگوں اور آرزوؤں کا محور تھا۔ اس سے رُوگردانی نہ کانگرسی قیادت کے بس میں تھی اور نہ برطانوی حکمران اسے ٹال سکتے تھے۔ سر خضر حیات ٹوانہ کے نزدیک مستقبل قریب میں نہ تو برطانوی اقتدار ختم ہونے والا تھا اور نہ پاکستان کا قیام ممکن تھا۔ وہ خودفریبی کے حصار میں گھرے ہوئے اور برطانوی مفادات کی پاسداری میں اس قدر مگن تھے کہ زمینی حقائق ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔

مسلم لیگ نے ۴۶-۱۹۴۵ء کے الیکشن پاکستان کے حصول کے نام پر لڑے تھے اور اس میں اسے فقید المثال کامیابی نصیب ہوئی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو ۱۷۵ کے ایوان میں ۷۹ نشستیں حاصل ہوئیں اور یونینسٹوں کے ۱۰ ارکان تھے۔ ان میں سے بیشتر ارکان مسلم لیگ سے ملنے کے لیے تیار تھے۔ غیر مسلم ارکان بھی یونینسٹ پارٹی کو داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ اس طرح بھان متی کا کنبہ بکھرنے والا تھا۔ اس شکست کے بعد سر خضر حیات ٹوانہ کو وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ نہ صرف وزارتِ عظمیٰ سے چمٹے رہے بلکہ کانگرس اور اکالی دل کے ساتھ مل کر انھوں نے نئی وزارت تشکیل دی۔ مہر کے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ تھا:

> لیگ پارٹی اصولاً وزارت بنانے کی سب سے بڑھ کر حق دار ہے اس لیے کہ وہ اسمبلی کی سب سے بڑی پارٹی ہے اور اکثریت کی نمائندہ ہے۔ باقی رہا دوسری پارٹیوں سے گفتگو کا معاملہ تو ہمارے نزدیک مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بہترین صورت یہ ہے کہ لیگ پارٹی اور یونینسٹ مسلمان مل جائیں اس لیے کہ اسلامی تنظیم کے اصول و مقاصد کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس حالت میں دوسری غیر مسلم یا سیاسی پارٹیوں سے جو گفت و شنید ہوگی اس

> میں مسلمانوں کے واضح مقاصد اور حیثیتِ کارفرمائی ہر خطرے اور ہر خلا سے محفوظ رہے گی۔[۳۰]

مسلم لیگ نے وزارت سازی کے لیے اکالی پارٹی کے سردار اجل سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ سے مذاکرات کیے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پنجاب کے اچھوت ارکان، عیسائی اور آزاد ارکان وزارت سازی کے لیے مسلم لیگ سے ملنے پر آمادہ تھے اور مسلم لیگ مطلوبہ اکثریت بھی حاصل کر لیتی لیکن انگریز گورنر نے مسلم لیگ کی وزارت نہ بننے دی۔ خضر حیات کو گورنر سر برٹرینڈ گلینسی (Bertrand James Glancy) کی آشیر باد حاصل تھی۔

۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو یونینسٹ پارٹی نے اکالی دل اور کانگرس کے ساتھ مل کر وزارت تشکیل دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بخوبی اندازہ تھا کہ خضر حیات ٹوانہ اور یونینسٹ پارٹی مسلمانوں کا مسترد شدہ گروہ تھا۔ کانگرس، اکالی دل اور خضر حیات کے ساتھیوں میں صرف مسلم لیگ دشمنی کی قدر مشترک تھی۔ نہ ان کے سیاسی مقاصد ایک تھے نہ ہی ان کے اقتصادی منصوبوں میں اشتراک تھا۔

مہر نے اس موقع پر لکھا تھا:

> پنجاب میں جو وزارت بنی ہے اسے اس کا بڑے سے بڑا حامی بھی صحیح اور نمائندہ قرار نہیں دے سکتا اس لیے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جس وزارت سے الگ ہو وہ کسی بھی حق دوست انسان کے نزدیک صحیح وزارت نہیں ہو سکتی۔ پنجاب میں موجودہ دستور کے تحت اس قسم کی غیر طبعی حالت پہلی مرتبہ پیدا ہوئی ہے اور اس پر مسلمانوں میں تشویش و اضطراب یا غم و غصے کے جذبات پیدا ہوئے ہیں تو انھیں کوئی شخص ناواجب قرار نہیں دے سکتا۔[۳۱]

مارچ ۱۹۴۶ء میں قائم ہونے والی وزارت سراسر کانگرس اور اکالی دل کے رحم و کرم پر قائم تھی اور خضر حیات خان اور ان کے رفقا نہ صرف بے اثر ہوئے بلکہ عملاً کانگرس کے مرغانِ دست آموز ثابت ہوئے۔ اس دور میں انتظامیہ کمزور ہوئی اور قانون شکنی عام ہوئی۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر اسلحہ جمع کیا اور آئندہ فسادات کی تیاریاں کیں۔

جنوری ۱۹۴۷ء خضر حکومت نے جلسے، جلوس اور سیاسی اجتماعات پر پابندی عائد کی۔ پنجاب کے مسلمان جو پہلے ہی اس حکومت سے بیزار تھے، سول نافرمانی پر اُتر آئے۔ حکومت نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور

راشٹر یا سیوک سنگھ کو غیر قانونی قرار دیا۔ان جماعتوں کو جنگِ عظیم دوم سے قبل کی فاشسٹ اور نازی جماعتوں سے مشابہت دی گئی۔[۳۲] مسلم لیگ نے خضر وزارت کے خلاف ''راست اقدام'' کیا۔لاکھوں مسلمان مظاہروں میں شریک ہوئے اور ہزاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔آخر حکومت کے پران جواب دے گئے اور ۲۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور راشٹر یا سیوک سنگھ پر پابندی ختم کر دی گئی اور لیگی رہنمار ہا کر دیے گئے۔[۳۳]

پنجاب حکومت نے جلسوں اور سیاسی اجتماعات پر پابندی برقرار رکھی لیکن ایک زوال آمادہ وزارت ان پابندیوں سے معاشرے میں انتشار اور خود اپنی بربادی کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ان سوختہ سامانوں کو آنے والے دور کی خانہ جنگی اور صوبۂ پنجاب کی بربادی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔سیاسی محاذ آرائی سے مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور مطالبۂ پاکستان نے شدت اختیار کر لی۔۲۶ فروری ۱۹۴۷ء کو خضر حیات ٹوانہ نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔[۳۴] اس کے بعد برطانوی گورنر نے دفعہ ۹۳ کا سہارا لے کر صوبے میں گورنر راج قائم کر دیا۔

انقلاب نے اپریل ۱۹۲۲ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے عرصے میں پنجاب میں مسلم حقوق کی بازیابی کے لیے بھرپور جہاد کیا۔ملک اور صوبے میں ہندوؤں کے سیاسی اور معاشی اور تہذیبی غلبے کے خلاف مسلسل جدجہد کی، کیونکہ ہندوؤں کا غلبہ مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تباہی کے ساتھ مشروط تھا۔یہ کاوشیں بالآخر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے مطالبے پر منتج ہوئیں۔انقلاب جنوری ۱۹۳۱ء سے حصولِ پاکستان کے لیے کوشاں تھا۔۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کی قراردادِ پاکستان کی تدوین میں مہر کا دخل تھا۔ان خدمات کے باوجود مہر کی خدمات کا نظر انداز کیا جانا درحقیقت مدیرانِ انقلاب کی کرنی کا پھل تھا۔وہ مسلم لیگ اور یونینسٹ کی کش مکش کے دوران یونینسٹوں کا ساتھ دینے میں حد سے تجاوز کر گئے۔اور بدلتے ہوئے سیاسی موسم کے ادراک میں ناکام رہے۔

مدیرانِ انقلاب کو بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا بے حد دکھ تھا اور وہ اس غم کو آخر تک بھلا نہ پائے۔وہ ان صوبوں کی تقسیم کا ذمہ دار مسلم لیگی قیادت کو تصور کرتے تھے حال آنکہ مسلم لیگ آخری وقت تک ان صوبوں کی تقسیم کی مخالف رہی۔ان کی غیر منصفانہ تقسیم کی ذمہ دار برطانوی حکومت اور کانگرسی قیادت تھی۔دونوں قوتیں ہندوستان کی تقسیم کی مخالف تھیں۔حالات کے جبر کے تحت وہ بادلِ نخواستہ اس پر راضی بھی ہوئیں تو حتی الامکان

پاکستان کو نقصان پہنچایا۔

پاکستان بننے کے بعد انقلاب اپنے حلقۂ قارئین کے بڑے حصے سے محروم ہوا۔مدیرانِ انقلاب کا برسوں کا جمع شدہ سرمایہ اور جائیدادیں مشرقی پنجاب میں غارت ہوئیں۔معاشی بنیادیں متزلزل ہونے کے بعد زوال آمادہ انقلاب کا دوبارہ پنپنا محال تھا۔قیام پاکستان کے بعد انقلاب نے مسلم لیگی قیادت کی بدانتظامی پر کڑی نکتہ چینی کی اور متروکہ املاک کی بندر بانٹ پر انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔صوبائی حکومت نے اخبار کے اشتہارات اور نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا۔انقلاب کو مہنگے داموں بازار سے کاغذ خریدنا پڑا۔

مہر نے اپنے اداریے میں صوبۂ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خاں کے آمرانہ ہتھکنڈوں کی شدید مذمت کی۔حکومتِ سرحد نے صوبۂ سرحد میں انقلاب کے داخلے پر پابندی عائد کر دی۔انقلاب ڈھائی تین سال سے معاشی مشکلات میں مبتلا تھا۔مہر اور سالک کے دوستوں کے قرض نے اسے مالی سہارا دیا تھا لیکن ڈوبتے اخبار کے لیے یہ تنکے کا سہارا تھا۔آخر مسلسل نقصان اُٹھانے کے بعد مہر اور سالک نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔

حوالہ جات

* *محقق و مصنف، ایم۔اے۔ایریا اسٹڈیز: جنوبی ایشیا، سواس، لندن یونی ورسٹی، مقیم کراچی۔*

۱۔ عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال (کراچی: اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۳ء)، ص ۲۲۳۔

۲۔ روزنامہ انقلاب، ۴۳:۳ (۱۰ اگست ۱۹۲۸ء)۔

۳۔ محمد حمزہ فاروقی، ''خطبۂ الہ آباد کا پس منظر'' مشمولہ بین الاقوامی فکرِ اقبال سیمینار (لاہور: خانۂ جمہوری ایران، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۹۸۔

۴۔ نقوش، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء): ص ۱۴۸۔

۵۔ روزنامہ انقلاب، ۱۶۹:۵ (۳۰ دسمبر، ۱۹۳۰ء)؛ ۱۷۰:۵ (۳۱ دسمبر، ۱۹۳۰ء)۔

۶۔ روزنامہ انقلاب، ۱۷۱:۵ (۲ جنوری، ۱۹۳۱ء)۔

۷۔ طارق، اے آر، مرتب *Speeches and Statements of Iqbal* (لاہور، اپریل ۱۹۷۳ء)، ص ۱۲۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۔۱۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۱۰۔ اداریہ، انقلاب، ۱۷۷:۵ (۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء)۔

۱۱۔ اداریہ،انقلاب،۵:۱۸۰(۱۵جنوری۱۹۳۱ء)۔

۱۲۔ اداریہ،انقلاب،۵:۱۹۷(۴فروری۱۹۳۱ء)۔

۱۳۔ اداریہ،انقلاب،۶:۱۹۲،سنڈے ایڈیشن(۱۰جنوری۱۹۳۲ء)۔

۱۴۔ اداریہ،انقلاب،۶:۱۹۷(۱۶جنوری۱۹۳۲ء)؛ ۶۔۲۲۶(۲۲فروری۱۹۳۲ء)۔

۱۵۔ اداریہ،انقلاب،۶:۲۳۹(۱۰مارچ۱۹۳۲ء)۔

۱۶۔ اداریہ،انقلاب،۶:۲۵۱(۲۴مارچ۱۹۳۲ء)۔

۱۷۔ روزنامہ،انقلاب،۶:۲۴۸(۲۰مارچ۱۹۳۲ء)؛ ۶:۲۵۰(۲۳مارچ۱۹۳۲ء)۔

۱۸۔ اقبال اور ان کے رفقا کا بیان ''مسلمانانِ پنجاب کے نام اپیل'' کے عنوان سے ایک پریس میں چھپا تھا۔محمد حمزہ فاروقی،مرتب اقبال کا سیاسی سفر (لاہور:بزمِ اقبال،۱۹۹۲ء)،ص۵۲۳۔۵۲۶۔

۱۹۔ انقلاب،۱۱۔۴۳،سنڈے ایڈیشن(۱۷مئی۱۹۳۶ء)؛فاروقی،اقبال کا سیاسی سفر،ص۵۳۰۔۵۳۴۔

۲۰۔ ایس۔ایم۔برک،سلیم الدین قریشی، *Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah: His Personality and His Politics.* (کراچی:اوکسفر ڈیونیورسٹی پریس،۱۹۹۷ء)،ص۲۳۰۔۲۳۱۔

۲۱۔ عاشق حسین بٹالوی، ہماری قومی جد وجہد (لاہور:البیان،۱۹۶۶ء)،ص۱۶۔

۲۲۔ اسٹینلے۔اے۔ولپرٹ، *Jinnah of Pakistan.* (کراچی:اوکسفر ڈیونیورسٹی پریس،۱۹۹۷ء)،ص۳۰۔

۲۳۔ ایس۔ایم۔برک،سلیم الدین قریشی،ص۲۷۰۔۲۷۱۔

۲۴۔ پینڈرل مون(Penderel Moon)، *Divide and Quit* (کراچی:آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،س۔ن)،ص۳۸۔

۲۵۔ اداریہ،انقلاب،۲۱:۳۰(۱۴جنوری۱۹۴۶ء)۔

۲۶۔ محمد حمزہ فاروقی، مہر اور ان کا عہد (کرچی:پاکستان اسٹڈیز سنٹر جامعہ کراچی،۲۰۰۸ء)،ص۱۸۴۔۲۰۴۔

۲۷۔ ابوسلمان شاہ جہاں پوری،مرتب مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم: ایک مطالعہ (کراچی:مجلس یادگارِمہر،نومبر۱۹۹۲ء)،ص۷۶۔۷۷۔

۲۸۔ محمد اشرف،مولانا عبدالمجید سالک۔حیات اور کارنامے (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی،اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)،ص۲۲۳۔۲۲۴۔

۲۹۔ محمد عالم مختارِحق،مرتب گنجینۂ مہر جلداول(لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۸ء)،ص۲۶۸۔

۳۰۔ اداریہ،انقلاب،۲۱:۷۳(۱۰مارچ۱۹۴۶ء)۔

۳۱۔ ایضاً،۲۱:۷۷(۱۵مارچ۱۹۴۶ء)۔

۳۲۔ اسٹینلے۔اے۔ولپرٹ،ص۳۰۷۔

۳۳۔ پینڈرل مون (Penderel Moon)،ص۷۵۔

۳۴۔ ایضاً،ص۷۷۔

مآخذ

اشرف،محمد۔مولانا عبدالمجید سالک۔حیات اور کارنامے۔غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی،اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔

بٹالوی،عاشق حسین۔اقبال کے آخری دوسال۔کراچی:اقبال اکیڈمی کراچی،۱۹۶۳ء۔

________۔ ہماری قومی جد وجہد ۔لاہور:البیان،۱۹۶۶ء۔

برک۔ایس۔ایم۔،قریشی،سلیم الدین ۔ *Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah: His Personality and His Politics*۔کراچی:اوکسفر ڈیونیورسٹی پریس،۱۹۹۷ء۔

روزنامہ انقلاب،۵:۱۶۹(۳۰دسمبر،۱۹۳۰ء)؛۵:۱۷۰،(۳۱دسمبر،۱۹۳۰ء)؛۵:۱۷۱،(۲جنوری،۱۹۳۱ء)۔

شاہ جہاں پوری،ابوسلمان۔مرتب مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم: ایک مطالعہ ۔کراچی:مجلس یادگارِمہر،نومبر ۱۹۹۲ء۔

طارق،اے۔آر۔مرتب *Speeches and Statements of Iqbal*۔لاہور،اپریل۱۹۷۳ء۔

فاروقی،محمد حمزہ۔مرتب اقبال کا سیاسی سفر ۔لاہور:بزمِ اقبال،۱۹۹۲ء۔

________۔''خطبۂ الہ آباد کا پس منظر''۔بین الاقوامی فکرِ اقبال سیمینار۔لاہور:خانۂ جمہوری ایران،۱۹۹۸ء۔

________۔ مہر اور ان کا عہد۔ کرچی:پاکستان اسٹڈیز سنٹر،جامعہ کراچی،۲۰۰۸ء۔

مختارِحق،محمد عالم۔مرتب گنجینۂ مہر ۔ جلداول۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۸ء۔

مون،پینڈرل(Penderel Moon)۔ *Divide and Quit.*۔کراچی:اوکسفر ڈیونیورسٹی پریس،س۔ن۔

مہر،غلام رسول۔''اداریہ''۔روزنامہ انقلاب لاہور(۱۱جنوری۱۹۳۱ء؛۱۵جنوری۱۹۳۱ء؛۴فروری۱۹۳۱ء؛ ۱۰جنوری۱۹۳۲ء؛ ۱۶جنوری۱۹۳۲ء؛ ۲۲فروری۱۹۳۲ء؛ ۱۰مارچ۱۹۳۲ء؛۲۴مارچ۱۹۳۲ء؛۲۰مارچ۱۹۳۲ء؛۲۳مارچ۱۹۳۲ء)

مے کش،احمد خاں۔سہ ماہی نقوش۔ شمارہ۱۰۴(جنوری۱۹۶۶ء):ص۱۴۸۔

ولپرٹ،اسٹینلے۔اے۔ *Jinnah of Pakistan.*۔کراچی:اوکسفر ڈیونیورسٹی پریس،۱۹۹۷ء۔